مثنوی گلزار نسیم

گلزار نسیم، نہال چند لاہوری کے نثری قصے ''مذہب عشق'' کا منظوم ترجمہ ہے لیکن نسیم نے اس قصے کو اس طرح اپنا لیا ہے کہ ''مذہب عشق'' کو لوگوں نے فراموش کر دیا۔ اس مثنوی میں جو کہانی پیش کی گئی ہے وہ ہندی الاصل نہیں، نہ ہی اسکا تعلق ایرانی لوک کتھاؤں سے ہے بلکہ اسکی تشکیل میں ہندی و ایرانی دونوں روایتوں کا ہاتھ ہے۔ اس کی تخلیق ہندوستان ہی میں ہوئی۔ اس میں ہندو مسلم تہذیب کے ملے جلے اثرات نمایاں ہیں۔ شہزادے کے گل بکاولی کی تلاش میں نکلنے سے شادی ہو جانے تک ایرانی رنگ اور اندر سبھا کے واقعہ سے بکاولی کے دوبارہ پیدا ہونے تک ہندوستانی رنگ غالب ہے کرداروں کے زین الملوک، تاج الملوک جیسے فارسی اور چترسین اور چتراوت جیسے ہندی نام بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں اسی طرح بعض قصوں میں امیر حمزہ، الف لیلہ، یعقوب و یوسف اور بوستاں خیال کے واقعات کا گمان ہوتا ہے تو کچھ قصوں میں ہندوستانی لوک کتھاؤں کا رنگ غالب ہے ایسا صرف گلزار نسیم ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ بقول گوپی چند نارنگ ''مثنوی نگاروں نے انھیں (ہندی و اسلامی اجزاء) اپنے تخیل کے سانچے میں اس خوبی و خوش اسلوبی سے بٹھایا ہے کہ ان میں عرب کے سوز دروں، عجم کی نفاست اور ہند کی لطافت نے باہم گھل کر فریب نظر کی ایک نئی کیفیت پیدا کر دی ہے۔''

''کہانی پن'' کے اعتبار سے اس مثنوی میں کوئی ندرت اور نیا پن نہیں۔ وہی عشق و محبت کے روایتی انداز، شہزادے اور شہزادی کی آنکھ مچولی، طلسمی فضا، مافوق الفطرت عناصر کی بھرمار، شجاعت و بہادری سے کہیں زیادہ قسمت کی یاوری سے گوہر مقصود حاصل کر لینے جیسے واقعات، ظاہر ہے کہ آج کے سائنسی ذہن کو کسی طرح اپیل نہیں کر سکتے لیکن جس عہد سے اس مثنوی کا تعلق ہے اس میں لوگوں کی دلچسپیاں ایسے ہی غیر فطری و مصنوعی واقعات تک محدود تھیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ خود ایسی ہی مصنوعی فضاؤں میں سانس لے رہے تھے اور ایسی ہی غیر فطری زندگی گزار رہے تھے۔

دوسری مثنویوں کی طرح گلزار نسیم بھی فرضی ہونے کے باوجود اپنے عہد کی معاشرت اور تہذیب وتمدن کی عکاس وترجمان ہے۔ اس مثنوی کے فرضی قصے کے پس منظر میں کچھ حقیقی واقعات ہیں جنھیں مثنوی نگار کے تخیل نے قصے کی شکل میں ڈھال دیا ہے۔ یہ مثنوی زبان کا چٹخارہ اور تفریح طبع کا سامان تو فراہم ہی کرتی ہے، ساتھ ہی اپنے مخصوص عہد کے مزاج ومعاشرت، نظریہ حیات عقائد، توہمات اور اجتماعی ذہن کی نباض اور آئینہ دار ہے اور اپنے متعلقہ معاشرے کی ذہنی، سماجی اور تہذیبی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

گلزار نسیم لکھنوی تہذیب کی نمائندہ وترجمان ہے۔ اس کے ہر کردار پر لکھنوی تہذیب کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ آرائش وزیبائش، نشست وبرخاست، رسوم وروایت، شادی بیاہ، رقص وسرود کی مجلسیں تمام ہی لکھنوی تہذیب کا عکس دکھائی دیتی ہیں۔ لکھنوی معاشرت کی طرح اس مثنوی میں بھی عورتوں کی فرمانی نظر آتی ہے، صنف نازک کی اہمیت اور مردوں کی کم ہمتی کا اندازہ ان اشعار میں ملاحظہ ہو جو خط کی شکل میں تاج الملوک نے گل بکاولی کو لکھا ہے۔ یہ اشعار لکھنوی اقدار حیات کے ترجمان ہیں۔

تجھ سے مری خاطر اب کہاں جمع تو بستر شعلہ، میں رگ شمع
تو جوشش یم، میں مور بے پر میں نقش قدم، تو باد صرصر

اس مثنوی کی اہمیت اس کی فنی خوبیوں کی وجہ سے زیادہ ہے۔ یہ مثنوی لکھنؤ کے شائستہ ترین ادبی مذاق کی آئینہ دار ہے۔ لکھنوی تہذیب کے تصنع اور نزاکت کا واضح اثر ہمیں اس مثنوی کے اسلوب اور لب ولہجہ میں نظر آتا ہے۔ نسیم نے صنائع وبدائع، بندشوں کی چستی اور تشبیہات واستعارات پر اتنا زور صرف کیا ہے کہ اسکے نتیجے میں مثنوی کی فضا رنگوں کے امتزاج سے کافی رنگین ہوگئی ہے اور الفاظ کے رکھ رکھاؤ اور تراش خراش سے ظاہری حسن تو یقیناً پیدا ہوگیا ہے لیکن مثنوی اس سوز وگداز اور نشتریت سے محروم ہوگئی ہے جس کا احساس ہمیں سحر البیان کے سادہ وسلیس لب ولہجہ میں ہوتا ہے۔

صنائع وبدائع کی زیادتی سے کلام میں تصنع اور آورد تو یقیناً پیدا ہوگئی ہے لیکن نسیم نے ان کا استعمال اتنے فنکارانہ انداز میں کیا ہے کہ ہم اس تصنع سے پیدا ہونے والے حسن اور استعجاب میں محو ہوجاتے ہیں۔ نسیم کی اسی فنکارانہ صلاحیت، ذہانت وطباعی اور زبان وبیان پر غیر معمولی قدرت کی وجہ سے ان کی مثنوی اردو زبان کا زندہ جاوید کارنامہ بن گئی۔